ڈاکٹر سید محمد عبداللہ

تازہ گوئی ــــــ ایک ادبی تحریک

"تازہ گوئی کیا ہے؟ کب شروع ہوئی؟ کس طرح بڑھی اور پھیلی؟ کس طرح بگڑی اور ختم ہوئی؟ یہ سب وہ سوالات ہیں جن کا معین اور قطعی جواب کسی ایک جگہ نہیں ملتا۔ عبدالباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی میں کم و بیش پچاس مرتبہ اس کا ذکر کیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ یہ ہے کیا؟

شبلی نے شعرالعجم میں لکھا ہے:

"باباؔ فغانی کے بعد ایک طرز خاص پیدا ہوا۔ عبدالباقی رحیمی جو ایرانی ہے اس کو "تازہ گوئی" سے تعبیر کرتا ہے اور علانیہ تسلیم کرتا ہے کہ اس کا بانی اور رہنما حکیم ابوالفتح تھا۔" (شعرالعجم، ج ۱۱، ص ۲۱)

عبدالباقی کے اصل الفاظ یہ ہیں:

" و مستعدان و شعر سنجان ایں زمان را اعتقاد ایں است کہ تازہ گوئی کہ دریں زمانہ درمیانہ شعرا مستحسن است و شیخ فیضی و مولانا عرفی شیرازی وغیرہ آں روش حرف زدہ اند باشارہ و تعلیم ایشاں بود۔" (ایشاں سے مراد حکیم ابوالفتح گیلانی ہے)۔" (ص ۸۴۸ کلکتہ ایڈیشن)

ان عبارتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ:

(الف) یہ طرز خاص بابا فغانی کے بعد پیدا ہوا۔

(ب) حکیم ابوالفتح گیلانی اس طرز کے محرک (؟) تھے اور شعرا نے ان کے اشارہ و تعلیم سے یہ طرز اختیار کیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ طرز بابا فغانی نے خود ایجاد کیا؟ ــــ یا اس کے بعد کسی نے ایجاد کیا ــــ؟ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابا فغانی نے ایک خاص روش پیدا کی جس کی پیروی بعد میں اور لوگوں نے کی۔ ہفت اقلیم میں لکھا ہے:

"۔۔۔۔ شاعر نغز گو بود و در غزل روشِ نو اختراع کرد، اما شعرائے خراسان طرز فغانی را مخالفت کردند، بنا براں فغانی

ہرات را بگزاشت و نزد سلطان یعقوب رفت و آنجا مورد التفات شاہانہ شد و بہ خطاب بابائے شعرا مخاطب گشت۔"

اس سے یہ معلوم ہوا کہ شعرائے خراسان نے طرز فغانی کو پسند نہ کیا جس کی وجہ سے فغانی بغداد (عراق) چلا گیا جہاں اسے قبول عام حاصل ہوا اور دوسرے شعرا نے پیروی کی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ میر علی شیر نے مجالس النفائس میں اس کا ذکر ایک سطر میں کیا ہے اور کہا صرف یہ ہے کہ "او ہم از شیراز است"۔ ——— اس کے بعد اس کا ایک ہی شعر درج کیا ہے۔ اس صورت حال میں، دو نئے سوال پیدا ہوتے ہیں،

اول: خراسان کے شعرا نے طرز فغانی کو کیوں پسند نہ کیا؟

دوم: شعرائے خراسان کا اپنا طرز کیا تھا؟

بابا فغانی کے زمانے کے خراسان کا اہم ادبی مرکز ہرات تھا۔ میر علی شیر وزیر اور سلطان حسین بیقرا فرمانروا تھا۔ تیموری شہزادے بلکہ شہزادیاں بھی ادب و شعر میں ممتاز تھیں، بابر شاعر بھی تھا اور نقاد بھی تھا۔ یہ بھی ہرات کے ادبی مرکز سے متاثر تھا۔ اگرچہ بعض معاملات میں اس کی رائے آزاد ہے۔

خراسان (ہرات) کے شعرا کے بارے میں، میر علی شیر نے مجالس النفائس میں اور سام میرزا نے تحفۂ سامی میں تفصیل سے لکھا ہے۔ ان میں جامی، آصفی، بنائی، ہلالی وغیرہ کو خاص اہمیت دی ہے، گویا یہی لوگ اس زمانے کے خراسانی طرز کے نمائندے تھے۔

یہ واضح رہے کہ عراق و خراسان کی یہ کش مکش خاصی قدیم معلوم ہوتی ہے۔ تذکرۂ دولت شاہ میں اس کی جھلک بار بار نظر آتی ہے۔ اس نے خراسان، ماوراء النہر، سمرقند، عراق اور شیراز کے الگ الگ دبستانوں کا ذکر کیا ہے۔

دولت شاہ کی تصریحات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خراسان میں سادگی نامقبول تھی "غزنوی دور میں اغراق و اشتقاق کو بڑا قبول حاصل ہوا ۔۔۔۔۔ اور صنائع بدائع پر خاص توجہ تھی" (دولت شاہ ص ۵۰، ۱۵۷) مگر تشبیہات میں اشیائے فطرت سے مواد حاصل کیا جاتا تھا۔ بعد کے دور میں ساری توجہ مبالغہ پر صرف ہوئی اور حقیقت سے بُعد ان کا وصفِ خاص ٹھہرا۔ عراق اور خراسان کی شاعری کے امتیازات اپنی جگہ جو بھی تھے، سو تھے لیکن خراسان اور ماوراء النہر کی اپنی اپنی روش بھی تھی۔ ماوراء النہر کے شعرا، شوکتِ الفاظ، صوتی طنطنہ اور معانی کی رعب دار فضا کے قائل تھے۔

بہر حال عراق و خراسان کا یہ فرق ہمیشہ قائم رہا۔ فغانی کے زمانے میں ہرات کا ادبی ذوق اصولاً

اسی روش کے مطابق چل رہا تھا ـــــ یعنی توجہ زیادہ تر صنعت پر تھی، اور صحت مند تنقید نے اسی زمانے کی اس روش پر لے دے بھی کی ہے۔

بابر کہ خود بھی شاعر تھا، سلطان حسین بیقرا کے زمانے کی شاعری پر، کئی موقعوں پر تنقید کرتا ہے، اس سے اس دور کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ آصفی کے متعلق لکھتا ہے: "شعرا و از رنگ و معنی خالی نیست" بنّائی کے بارے میں کہتا ہے: "در غزل او رنگ و حال ہر دو نیست۔"

ان دونوں اقتباسات میں 'رنگ' کا لفظ بڑا ایہام معنی ہے جو ایک جگہ معنی کی ضد ہے اور دوسری جگہ حال کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بابر کا ادبی ذوق جہاں معنی اور حال (جذبات کی سچائی) پر زور دیتا ہے وہاں رنگ کو بھی غیر معمولی بلکہ فائق اہمیت دیتا ہے اور رنگ سے مراد، بیان کا حسن اور اسلوب کی شان ہے۔ یہ بابر کے ذاتی خیالات ہیں اگرچہ فطری طور پر دوسرے لوگ بھی مانتے ہوں گے۔ جذبات کی سچائی اور اسلوب کی شان کے ساتھ ساتھ واقعیت کو بھی وہ بڑی اہم شے سمجھتا ہے۔

ہرات کا ایک شاعر ہلالی اپنی مثنوی شاہ و گدا میں یہ غلطی کر بیٹھا تھا کہ شاہ کو معشوق اور گدا کو عاشق قرار دے دیا۔ اس پر بابر بگڑ کر کہتا ہے" یہ کیا مذاق ہے؟ پچھلے شاعر تو اپنی عاشقانہ مثنویوں میں مرد کو عاشق اور معشوق کو عورت کہتے رہے ہیں۔ مگر ہلالی کو دیکھو کہ اس نے درویش کو عاشق اور بادشاہ کو معشوق بنا دیا۔ . . . گویا بادشاہ کو" فاحشہ" بنا دیا۔"

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بابر، شاعری میں افسانوی اختراع و تصرف کے مقابلے میں اصلیت و واقعیت پر خاص نظر رکھتا ہے اور اسے ہرات کے اس شاعر کی یہ روش پسند نہیں آئی کہ اس نے ایک ایسی بات فرض کر لی جسے زمانے کا مجلسی معیار اچھا نہیں سمجھ سکتا۔ ممکن ہے اس رائے میں بابر کی شاہانہ رگ حمیت بھی پھڑک رہی ہو۔ ورنہ بادشاہوں کو معشوق بنانے کی رسم تو موجود ہی رہی ہے مثلاً تیموری شہزادے بایسنغر مرزا نے اپنے ایک شعر میں خود کہا ہے:

گدائے کوئے خوباں بایسنغر
گدائے کوئے خوباں بادشاہ است

یہ صحیح ہے کہ یہاں گدائی میں بھی بادشاہانہ طنطنہ ہے تاہم بادشاہ نے خود کو گدا کہہ کر بھی تو اپنی حیثیت عرفی کو گرایا ہے۔ بابر کو یہ بھی گوارا نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ ہرات کا ادبی ذوق اس زمانے میں چند اوصاف پر خاص توجہ دیتا تھا۔ مثلاً رنگ اسلوب یعنی بیان کا حسن، اور معانی میں دور کے مضامین ——— ہرات (خراسان) کی شاعری عبارت انھی اوصاف سے تھی۔

فغانی کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس نے شاعری میں ایسی روش اختیار کی جو شعرائے خراسان میں مقبول نہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی ایسی روش ہوگی جو ہرات (خراسان) دبستان کے مذکورہ اوصاف سے مختلف ہوگی۔

فغانی کے کلام کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کے نزدیک شاعری کا اصل مقصد جذبات کا موثر اظہار ہے، اسلوب بیان کو اس کے تابع سمجھتا ہے۔ اسلوب تو مضمون کے پیچھے پیچھے قدرتی طور پر خود بخود آجاتا ہے۔

اس کی مزید تشریح کے لیے ان شعرا کا ذکر مفید ہوگا جنھیں فغانی کا مقلد سمجھا جاتا ہے۔ مخزن الغرائب میں وحشی یزدی کے بارے میں لکھا ہے:

"وے طرز بابا فغانی شیرازی اختیار نمودہ، و شوخی . . . . براں افزودہ . . . . واز زبان عشق آگاہ است، لہذا کلام او مقبول خاص و عام است۔"

یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کے کلام میں شوخی، طراحی، اور ادابندی کے خصائص ہیں۔ ان اصطلاحوں کی صحیح نوعیت کیا ہے میں ابھی فیصلہ نہیں کر سکا۔ بہرحال مذکورہ بالا اقتباس کے دو حصے قابل غور ہیں۔ اول: شوخی براں افزودہ۔ دوم: از زبان عشق آگاہ است۔ یہ شوخی کیا ہے؟ اور زبان عشق سے کیا مراد ہے؟ اس بحث کو سردست ملتوی کرکے کچھ اور اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

نہاوندی نے مآثر رحیمی میں نظیری کے بارے میں لکھا ہے: "مقتدائے شاعران سخن دان و پیشوائے عاشقان صادق بیان" یہ آخری فقرہ، تقریباً وہی ہے جو اوپر دوسری طرح یوں آیا ہے "از زبان عشق آگاہ است۔"

صاحب مخزن الغرائب نے نظیری کے بارے میں لکھا ہے:

"وے طرز بابا فغانی را اختیار نمودہ وآں روبیہ را بحد کمال رسانیدہ، کلامش نہایت رقیق بہ پختگی دبرشتگی واقع شدہ ہرچہ از عذوبت نزاکت، لطافت گویند دارد۔"

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ صاحب مخزن، طرز بابا فغانی کو ان اوصاف سے کوئی الگ شے کہہ رہے ہیں یا ان اوصاف کو اس طرز کا حصہ قرار دے رہے ہیں۔ بہرحال یہ واضح ہے کہ نظیری کے ہاں وہ رقت کا وصف دیکھتے ہیں ـــــ اور رقت سے مراد ایسا مضمون اور ایسا بیان ہے جس سے میٹھا میٹھا درد پیدا ہو۔ اور یہ بھی وہی بات ہے جو "از زبانِ عشق آگاہ" کہہ کر مصنف پہلے بیان کر چکا ہے۔

مبتلا نے نظیری کے سلسلے میں اسی بات کو یوں ادا کیا ہے،

"کلامش مستمعان را بے اختیار از خویش می برد و بر جراحت دل دردمنداں نمک اضطراب می ریزد" (بحوالہ مے خانہ)

گویا نظیری کے عاشقانہ کلام میں درد و رقت کے عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سچے عاشقانہ جذبات کا اظہار کرتے ہیں اور اس کے لیے فطری اور موثر زبان و بیان استعمال کرتے ہیں۔ صنعت اور تکلف سے دور رہتے ہیں اور واردات قلبی کا راست اظہار کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طرز فغانی کاشان میں بطور خاص مقبول ہوئی۔ چنانچہ نظیری کے علاوہ مسیح کاشی نے بھی خاص اثر قبول کیا اور بابا فغانی کے دیوان کا جواب لکھا (مے خانہ ص ۲۶۳)۔ یہی حضرات کم و بیش اس طرز کو فروغ دینے والے ہیں۔ (دیگر متبعین کے لیے دیکھیے شعر العجم ج ۳۔ ص ۲۸)۔

اب یہ بات صاف ہو گئی کہ فغانی نے ہرات کی روش کے برعکس، شاعری (یعنی غزل) میں سچے عاشقانہ جذبات کے اظہار کو مرکزی اہمیت دی اور اس کے لیے (صنعت اور تکلف سے آزاد) موثر اور راست بیان کو رواج دیا ـــــ تازہ گوئی کی شاخ اسی شجر سے پھوٹی۔

یہ میرے لیے معما ہی ہے کہ لفظ تازہ گوئی کا رواج سب سے پہلے کب ہوا، معنی تازہ کی اصطلاح تو پہلے بھی تھی اور بہت بعد تک موجود رہی، لیکن تازہ گوئی کی اصطلاح کب ایجاد ہوئی، میں اس کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا ـــــ تاہم تازہ گوئی کی اصطلاح اپنے نئے مفہوم میں، مآثر رحیمی میں بڑے وثوق سے استعمال ہو رہی ہے، ممکن ہے کاشان میں سب سے پہلے اس کا استعمال ہوا ہو ـــــ یہ معلوم ہے کہ نظیری نے کاشان میں کچھ زمانہ گزارا جہاں تازہ گوئی شاید سب سے پہلے وجود میں آئی۔ نہاوندی اس کو ابوالفتح کا فیض قرار دیتا ہے مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ابوالفتح گیلانی نے اس طرز میں خود کیا کارنامہ انجام دیا۔ ممکن ہے اس کی ناقدانہ آرا نے شعرا کو متاثر کیا ہو جس طرح خان آرزو کی تنقیدوں نے میر و سودا کے زمانے کے شعرا کو متاثر کیا۔

معاملہ کچھ بھی ہو، یہ واقعہ ہے کہ اکبری، جہانگیری دور میں تازہ گوئی بڑی مقبول تھی - مآثر رحیمی میں نوعی کے متعلق لکھا ہے:

"درمیان مستعدان تازہ گوئی شہرت دارد۔" (ج ۳، ص ۸۰۷)

پھر لکھا ہے:

"و مستعدان و شعر سنجانِ ایں زماں را اعتقاد ایں است کہ تازہ گوئی کہ دریں زمانہ درمیانۂ شعرا مستحسن است و شیخ فیضی و مولانا عرفی شیرازی وغیرہ بآں روش حرف زدہ اند باشارہ و تعلیم ایشاں (ابو الفتح گیلانی) بودہ۔"

(ج ۳، ص ۸۴۸)

کامی سبزواری اور بقائی کو بھی تازہ گو قرار دیا گیا ہے (ایضاً ۸۶۳، ۸۸۷)

جسمی کے سلسلے میں لکھا ہے:

"کلامش از خامی ولغو و سائر عیوب کہ در کلام تازہ گویانِ ایں زماں باشد مبرا است۔" (ایضاً - ۹۲۸)

(مراد شاید یہ ہے کہ راست اور بے تکلف اظہار میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اسلوب کی نوک پلک کے بارے میں جو غفلت ہو جاتی ہے جسمی کا کلام اس سے پاک تھا)۔

جسمی کے خصائص کلام کے ضمن میں لکھا ہے:

"مولانا را اشعار مشکل و دقیقہ بسیار است۔" (ایضاً - ۹۲۹)

گویا اس کے کلام میں بیان کی پیچیدگی اور استعارہ وغیرہ کے اشکال زیادہ تھے - جو ذہن پر زور ڈالنے ہی سے سمجھ میں آ سکتے ہوں گے۔

ملا شیرازی "برادر رشکی" کو بھی تازہ گویاں میں شمار کیا گیا ہے۔ اور لکھا ہے:

"چنانچہ شکیبی ..... نظیری ..... عرفی سخنان او را بر اقران ترجیح نہادہ، اعتقاد تمام بہ تازہ گوئی و نادر سخنی او داشتند۔" (ایضاً - ص ۹۸۰)

تجلی کے بارے میں لکھا ہے:

"خود را از تازہ گویان و شیرین سخنان ایں زمان می داند و بر خفی و جلی اشعار متاخرین اطلاع دارد۔" (ایضاً ۱۰۲۷)

قبلا بیگ کو بھی تازہ گویاں میں شمار کیا ہے۔

صیدی کے متعلق لکھا ہے:

"مولانا حیدری تتبع طرز متاخرین می کند ——— از تازہ گویاں و نو آمدگان ایں زمان ...." (۱۱۲۹) اسے عرفی کا مقلد کہا گیا ہے۔

میر غروری کے تذکرے میں لکھا ہے کہ وہ کاشان سے ہے ——— اور اس کی نادرہ گوئی و تیزیں سخنی مشہور ہے (۱۱۳۳، ۱۱۳۶)

طبعی کے بارے میں لکھا ہے:

"وطرز تازہ کہ درمیانہ مستعدان ایں زمان است بغایت نیکو تتبع می کند و سلیقہ حالی دارد (۱۲۱۲)

مولانا نادم گیلانی کے متعلق لکھا ہے:

"الحق شاعرے تازہ گوی و نادر سخن است و بتازہ گوئی درمیانہ موزونان اشتہار دارد" (۱۲۶۷)

وجہی کو بھی تازہ گوؤں میں شمار کیا ہے (۱۲۸۹) حیدری اور لسانی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ متاخرین کی روش تازہ گوئی کو پسند نہ کرتے تھے (۱۳۲۷)۔

مولانا تسلی، عبد الباقی، تابعی اور فہمی کو بھی تازہ گویاں میں شمار کیا گیا ہے۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ نظیری کے ذکر میں تازہ گوئی کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے سلسلے میں لکھا ہے:

"ابداع معانی غریبہ و مضامین دلکش ..... پیشوائے عاشقان صادق بیان، ...."

اور اس کے خلاف رسمی شاعر کا یہ ہجویہ شعر لکھا ہے:

لباس لفظ شود تنگ در بر معنی   گہے کہ بکر معانیش بفگند چادر

اور کہا ہے کہ بعض عراق والے نظیری کی غزل کو عرفی کی غزل سے بہتر قرار دیتے تھے اور بعض برابر سمجھتے تھے۔

اس کے مقابلے میں عرفی کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اور کہا ہے کہ "او مخترع طرز تازہ ایست کہ حالا درمیانہ مردم معتبر ....."

"چندان ابداع معانی غریبہ و مضامین عجیبہ در ابیات عارفانہ عاشقانہ کہ او کردہ ہیچ کس نکردہ"

اس کے نزدیک گویا عرفی تازہ گوئی کا موجد ہے۔ پھر یہ بھی لکھا ہے کہ لوگ اس کی تقلید کرتے تھے اور اس کی تازہ گوئی کا عراق، فارس اور خراسان میں بہت چرچا تھا اور سب لوگ اسے افضل مانتے تھے۔

عرفی کے رتبہ بلند سے کسی کو انکار نہیں لیکن یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ وہ تازہ گوئی کا مخترع تھا البتہ یہ

کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی تازہ گو تھا اگرچہ اس کی اپنی ایک خاص طرز بھی تھی۔

حسین ثنائی کی بھی بہت تعریف کی ہے البتہ یہ لکھا ہے کہ اس میں "نارسائی لفظ" کا عیب تھا یعنی الفاظ معانی کا ساتھ نہ دیتے تھے۔

ملمی اور ملک قمی کو بھی تازہ گویان میں شمار کیا ہے۔ نوعی خبوشانی کے سلسلے میں لکھا ہے کہ وہ تازہ گو تھا لیکن "سخن او راشتر گربہ می گویند" —— یعنی اس پر حسن بیان کی طرف سے غفلت کا الزام تھا۔

ان بیانات سے یہ معلوم ہوا کہ نظیری، عرفی، شکیبی، ملمی وغیرہ دور اکبری جہانگیری کے تازہ گو شاعر تھے —— اور بقول علامہ شبلی ابو الفتح گیلانی اس طرز کے رہنما تھے —— اور اس طرز کی ابتدا بابا فغانی نے کی۔ یا بقول نہاوندی، عرفی نے۔

یہاں تک تو درست معلوم ہوتا ہے مگر یہ امر پھر بھی مشتبہ رہا کہ طرز تازہ گوئی کے خصائص کیا تھے، علامہ شبلی فارسی شاعری کے بہت بڑے مزاج دان ہیں مگر وہ بھی کوئی واضح تصور پیش نہیں کر سکے۔

فغانی اگر اس طرز کے موجد ہیں تو ان کے کلام کے خصائص کو تازہ گوئی کا ابتدائی نقش سمجھنا چاہیے۔ شبلی کی نظر میں فغانی کے خصائص وہی ہیں جن کا شمار متاخرین کے سلسلے میں کیا گیا ہے، یعنی:

۱۔ جو بات کہتے ہیں پیچ دے کر کہتے ہیں۔

۲۔ اکثر مضامین کی بنیاد الفاظ پر اور صنعت ایہام پر ہے۔ یعنی لفظ کے لغوی معنی کو ایک حقیقی بات قرار دے کر اس پر مضمون کی بنیاد قائم کرتے ہیں۔

۳۔ استعارات کی نزاکت اور جدت تشبیہ، اور زبان میں تکلفات کا پیدا ہونا۔

۴۔ اس زمانے میں الفاظ کی نئی تراشیں اور نئی نئی ترکیبیں پیدا ہوئیں۔ نشتر کدہ۔ مریم کدہ وغیرہ (اس سے زیادہ یہ کہ ایک بڑا خیال ایک چھوٹے سے لفظ سے ادا ہو جاتا ہے) ۔ (شعر العجم جلد ۳)

شبلی کہتے ہیں کہ یہ متاخرین اور نازک خیالوں کا دور ہے لہذا فغانی جو اس دور سے متعلق ہیں اسی قسم کی شاعری کرتے تھے لیکن راقم اس بیان سے متفق نہیں یہ خصائص عام متاخرین کے سلسلے میں تو درست ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم جلال اسیر اور شوکت بخاری تک کو بھی اس دور میں شریک سمجھ لیں لیکن تازہ گوئی کے خصوصی امتیازات یہ معلوم نہیں ہوتے کیونکہ ان میں سے بعض فغانی، نظیری اور فیضی کے خصائص نہیں سمجھے جا سکتے اگرچہ خال خال ان کے یہاں بھی ہو سکتے ہیں۔

مسئلہ بے حد مشکل ہے ـــــ اور شبلی نے بھی جو کچھ لکھا ہے انھیں مشکلات کے زیر اثر لکھا ہے ـــــ میں بھی خاصی محنت کے باوجود بڑی حد تک قیاسی باتیں ہی لکھ رہا ہوں، تاہم قیاسات کی بنیاد شاید محکم ہوگی۔

حافظ کی شاعری کو معراج کمال سمجھ کر بات کو آگے بڑھایئے۔ حافظ کے خصائص یہ تھے:

۱۔ حافظ نے مطالب میں مجاز و حقیقت کو یوں باہم ملا دیا کہ قاری اس کے کلام سے اپنے مذاق کے مطابق محظوظ ہو سکتا ہے۔

۲۔ اس کے مضامینِ تصوف عام عاشقانہ مضامین سے الگ نہیں کیے جا سکتے۔

۳۔ حسن بیان اور مضمون میں اس طرح ہم آہنگی پیدا کی کہ تکلف کا شائبہ تک نظر نہیں آتا ـــــ بیان کے عمدہ پیرائے اور مضامین کی بلندی ان کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

۴۔ زندگی کے مضامین کو جذبات عاشقانہ کے ساتھ اس طرح ملا کر پیش کیا کہ حافظ کی شاعری محض عاشقانہ شاعری نہیں رہی بلکہ زندگی کے وسیع تر دائرے کی ترجمان بن گئی، اس میں ہر قسم کے مضامین، مؤثر انداز میں بیان ہوئے ہیں اگرچہ ہر مضمون سنجیدہ ہے، ابتذال نہیں آنے پایا۔

۵۔ اس کے نزدیک زندگی کی حقیقت بے ثباتی ہے مگر زندگی کا رویہ خوش دلی ہے، یہ حافظ کا خاص مضمون ہے جو سارے دیوان میں پھیلا ہوا ہے۔

۶۔ سچائی کلام حافظ کی اہم خصوصیت ہے۔

۷۔ تاثیر اور روحانی ترفع، کلام حافظ کا خاصہ ہے۔

ان خصائص کی بنا پر حافظ کا کلام مقبول عام و خاص ہوا ـــــ اس میں جو مختلف عناصر حسن و خوبی دیا (بقول بابر رنگ و معنی) تھے ان کے امتزاج کی وجہ سے ہر ذوق کے لیے اس میں کشش کے سامان تھے۔ تقلید کرنے والوں کے لیے یہ امتزاج ممکن نہ ہوا ـــــ اگر کوئی ایک عنصر کی تقلید کرتا تو دوسرا رہ جاتا۔ تصوف پر آتا تو کلام میں صاف صوفیانہ نظر آتا۔ مجازی عشق کے معاملات کی گفتگو کرتا تو یہی مجازی مضامین سطح پر ابھرے ہوئے نظر آتے ـــــ، انھیں کاوشوں اور کوششوں کے اندر سے وحشی یزدی اور شرف جہان اور ولی دشت بیاضی سامنے آئے ہیں جن کا طرۂ امتیاز معاملہ بندی اور وقوع گوئی تھا۔ یہ بھی گویا ناکامی کا اعلان تھا یعنی ایک ہی موضوع پر قدرت! ۔ ہرات کی شاعری میں جامی کا رنگ دیکھیے

مجاز کے مطالب بالکل کھوکھلے معلوم ہوتے ہیں۔ جامی کا رجحان صوفیانہ مضامین کی طرف ہے، مجاز کی شاعری پھیکی ہے۔ ان کے کلام کا اصلی انداز صوفیانہ ہے۔

حافظ نے زندگی کے ہر مضمون کو (جو جذباتی سطح پر سوچا جا سکتا تھا) غزل میں پیش کرنے کا اسلوب اختیار کیا تھا مگر وقوع گو شرف جہاں قزوینی کے یہاں غزل محض عشقیہ مضمون کا سانچہ بن گئی، اخلاقی مجلسی مضامین غائب ہو گئے۔ ادھر جامی کے یہاں اخلاقی مضامین ہیں مگر بے مزہ ـــــ زندگی کے دوسرے جذباتی مواقع کو انھوں نے بہت کم چھیڑا ہے۔ اس طرح غزل کی ہمہ رنگی جس کو حافظ نے کمال تک پہنچایا تھا دورِ ہرات تک پہنچتے پہنچتے یک طرفہ اور یک مضمون چیز بن گئی ـــــ اور شاعری پرانے موضوعات کی تکرار تک محدود ہو کر رہ گئی۔

عرض کر چکا ہوں کہ حافظ نے شاعری کا جو نمونہ قائم کیا اس کی تقلید آسان کام نہ تھی اور جن شاعروں نے تقلید کی بھی وہ بھی ناکام رہے۔ نتیجہ یہی ہوا کہ رنگِ حافظ کے سوا ہر رنگ بے رنگ رہا۔

اوپر یہ ذکر بھی آ چکا ہے کہ جامی کے کلام میں حافظ کی نمود ہو ہی نہیں سکی۔ ان کے کلام سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مجاز و حقیقت کی کامیاب آمیزش نہیں کر سکے، ان کی غزل میں تصوف کا رنگ صاف نمایاں ہو جاتا ہے، پھر معشوق کی ستائش میں مبالغے کی صورت ایسی پیدا ہو جاتی ہے جو انسانی حسن سے زیادہ محبوبِ حقیقی کے حسن سے متعلق معلوم ہوتی ہے۔

اس کے مقابلے میں جو شعرا مجازی مذاق کے تھے وہ اتنے کھل کر مجازیت پر اتر آئے کہ ابتذال کا رنگ پیدا ہو گیا۔ جہاں ابتذال پیدا نہیں ہوا وہاں محض معاملہ بندی اور وقوع گوئی رہ گئی ہے جو دیر تک متاثر نہیں کر سکتی۔ زندگی کے وسیع تر مضامین جو حافظ کے یہاں تھے ان کا بگڑا ہوا عکس بھی کہیں نظر نہیں آتا۔

ان حالات میں تازہ گوئی کی تحریک، رنگِ حافظ کے احیا کی آرزو سے پیدا ہوئی۔ تکرار کی مجبوری معاف ہو تو عرض کروں کہ اسلوب میں حافظ نے بیان کے حسن پر خاص نظر رکھی لیکن صنعت گری نہیں کی بے تکلفی اور بے ساختہ پن کلامِ حافظ کے امتیازی اوصاف ہیں انھوں نے جو پیرایہ اختیار کیا ہے بے حد حسین ہیں مگر یہ حسن صنائع بدائع کی وجہ سے بے تکلف پیدا نہیں کیا، اس کے مقابلے میں ہرات کے دور میں صنائع کے زور سے، اور نہ تکلف حسن پیدا کرنے کی کوشش ہوئی اور بے ساختگی تقریباً مفقود

ہو گئی۔ تازہ گوئی اس طرز یا روش کے خلاف بغاوت تھی۔

بابا فغانی نے سب سے زیادہ اسی بے ساختگی پر زور دیا۔ ان کے کلام میں حافظ کی سی ہمہ رنگی نہیں مگر صنعت گری کا میلان بھی نہیں۔ انھوں نے جو مطالب ادا کیے روزمرہ کی زبان میں ادا کیے اور اس طرح جیسے کوئی بات چیت ادا کرتا ہے ـــــ اسی کو شبلی نے یوں ادا کیا ہے کہ "جو بات کہتے تھے بیچ دے کر کہتے تھے اور خیال کی کئی کڑیاں چھوڑ دیتے تھے۔" یہ خصوصیت اس لیے پیدا ہوئی کہ وہ لکھ نہیں رہے تھے گویا بول رہے تھے اور قاعدہ ہے کہ بات چیت کہنے والا بعض اجزائے کلام کو ترک کر دیتا ہے یہ سمجھ کر کہ سامع ان اجزا کو خود اپنے تخیل میں مہیا کرے گا۔

غرض فغانی اور ان کے مقلدین نے بیان کو صنعت کی قید سے نجات دلائی اور مضمون کو براہِ راست ادا کرنے کی رسم تازہ کی۔ یہی تازہ گوئی ہے۔

نظیری، عرفی، شکیبی وغیرہ تک، غزل میں معاملے کا راست بیان آ چکا تھا۔ مگر اکبری دور کے ذہن و ذوق نے اس ایک مضمون شاعری کو کافی خیال نہیں کیا ـــــ اس ذوق کی تشفی کے لیے اسے پوری زندگی کی وسعت اور خیالات کی تازگی کی ضرورت تھی۔ اس کے علاوہ عقلی مطالب کی جستجو بھی اس دور کا خاصہ ہے۔ شاعری میں تازگی اور وسعت کی یہ صورت خواہ ابوالفتح نے پیدا کی ہو یا کسی اور نے۔ اکبری جہانگیری دور کی زندگی طلب روح کا لازمی تقاضا بھی یہی تھا ـــــ اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے دبستانِ ہرات سے احتراز اور رنگ حافظ کی طرف بازگشت لازمی تھی چنانچہ نظیری وغیرہ شعوری طور پر ادھر متوجہ ہوتے نظر آتے ہیں:

تا اقتدا بحافظ شیراز کردہ ایم
منظور یار گشتہ نظیری کلام ما

نظیری نے "پیر ہری" کی سادہ بیانی کا بھی ذکر کیا ہے لیکن تقلید حافظ ہی کی ہے۔ ہر چند کہ رنگ حافظ پیدا ہو نہیں سکا۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ تازہ گوئی (خصوصاً اکبری جہانگیری زمانے میں) رنگِ حافظ کی طرف رجعت اور بازگشت سے عبارت ہے۔ یہ سبک ہندی کی روش قبیح نہیں تھی جیسا کہ ہاشم رضی (مرتب دیوان جامی) نے خیال کیا ہے بلکہ شاعری کو پھر زندگی کے قریب لانے اور اسلوب اظہار کو تکلفات سے

آزاد کرنے کی ایک کوشش تھی ـــــ یہ ایک کوشش تھی رنگ حافظ کے احیا کی[1] ـــــ یہ اور بات ہے کہ یہ شعرا اس میں کامیاب نہیں ہوئے اگرچہ اتنی کامیابی ضرور ہوئی کہ انھوں نے شاعری کی ایک نئی روش ایجاد کی جس کے مضامین میں زندگی کی سی ہمہ رنگی اور جس کے اسلوب میں راست بیانی اور سچائی اور بے تکلفی کا ایک خاص رنگ آ گیا ہے۔

تازہ گوئی کی بنیادی خصوصیات یہی ہیں ـــــ یہ شاعری علم کے زور سے نہیں چلی بلکہ سچے جذبات کی طاقت سے آگے بڑھی ـــــ یہ صحیح ہے کہ والہ داغستانی کو یہ بات اچھی نہیں لگی۔ اس نے افسوس ظاہر کیا ہے کہ شاعری اور علم میں فاصلے ہو گئے ہیں (تذکرۂ والہ داغستانی)، مگر شاعری کے لیے علم اتنا ضروری نہیں جتنی جذبے کی سچائی لازمی ہے، اور تازہ گوئی میں سچے جذبات بنیادی ہیں۔

اکبری جہانگیری دور کے تازہ گو شعرا میں قدر مشترک یہی اوصاف ہیں لیکن ہر شاعر کا ایک انفرادی دائرہ بھی ہے مثلاً نظیری کے یہاں جذبات محبت کا بے تکلف بیان، عرفی کے یہاں استعارہ، فیضی کے یہاں ہیجانی تراکیب۔ مآثر رحیمی میں حسین ثنائی کی بڑی تعریف آئی ہے مگر معلوم نہیں اس کا کیا خاص رنگ ہو گا۔ قیاس کہتا ہے یہ مشترک باتیں ضرور ہوں گی اور اپنا بھی کوئی رنگ ہو گا۔

تازہ گوئی کے خلاف دو چار شکایتوں کا ذکر مآثر رحیمی میں آیا ہے۔ ایک تو "نارسائی لفظ" کی شکایت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان شعرا کے یہاں الفاظ بعض اوقات اشارے بن جاتے ہیں اور مطلب سمجھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔ ممکن ہے یہ اعتراض صحیح ہو مگر یہ اسی طرز کا نتیجہ ہے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے شاعر بات چیت کا اسلوب جب بھی اختیار کرے گا اس میں اشاریت کا آنا لازم ہے۔

ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان شعرا نے سکہ بند مضامین غزل کو چھوڑ کر ہمہ رنگ مضامین ادا کیے، مگر میں کہہ چکا ہوں کہ یہ عیب نہیں خوبی ہے، تاہم یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات یہ شعرا عشقیہ مطالب میں ابتذال کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔ اور وہ وقار قائم نہیں رکھ سکتے جو شیوہ حافظ ہے۔ اسی طرح زندگی کے مضامین میں معمولی اور پیش پا افتادہ مضمون شامل کر دیتے ہیں۔ حقائق بلند

---

[1] ایرانی نقادوں کی یہ عادت ہے کہ وہ جس روش کو اچھا نہیں سمجھتے اسے سبک ہندی کہہ دیتے ہیں۔ تعجب ہے کہ دیوان جامی کے مرتب ہاشم رضی صاحب نے جامی کو سبک ہندی کا بانی قرار دیا ہے ـــــ اور تازہ گوئی کو ایک روش قبیح قرار دے کر جامی کو اس کا نقاش اول کہا ہے (دیکھیے مقدمہ دیوان جامی طبع ایران مرتبہ ہاشم رضی صاحب)

پر قادر نہیں ہوتے۔

یہ شعرا اپنی تشبیہات کا مواد جس دنیا سے لیتے ہیں وہ بھی معمولی اور عام ہے۔ اس کی وجہ سے ان کی شاعری کی فضا عام زندگی کے قریب ہو جاتی ہے مگر بعض اوقات اس میں فرو مائگی مضمون کا عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ عرفی اس فرو مائگی سے بچا ہے مگر معمولیات کی تشبیہیں اور استعارے اس کے یہاں بھی موجود ہیں۔

ان عیوب ——— یا خصائص کے باوجود، تازہ گوئی نے اپنے زمانے میں بڑی مقبولیت حاصل کی ——— مآثر رحیمی کے مصنف کا خیال یہ ہے کہ طالب آملی پہلا شخص تھا جو اس روش سے الگ ہوا ——— طالب آملی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے استعاروں میں نازکی اور پیچیدگی پیدا کی۔ اس کے استعارے تامل اور غور کے محتاج ہو گئے۔ یعنی اس نے مدعا سے زیادہ اسلوب کی طرف توجہ کی اور جذبے کی سچائی سے زیادہ بیان کو اہمیت دینی شروع کی۔

تازہ گوئی کی اصطلاح طالب کے بعد بھی ملتی ہے مگر اس کا مفہوم الگ صورتیں اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ بعض لوگ غلطی سے خیال بافی اور مضمون آفرینی کو بھی تازہ گوئی قرار دے رہے ہیں مگر یہ صحیح نہیں ——— یہ تو تازہ گوئی کی ضد ہے۔

کلمات الشعرا سرخوش اور مرآۃ الخیال شیر خاں میں جا بجا "معنی تازہ" اور "معنی یابی" کی اصطلاح ملتی ہے مگر یہ واضح رہے کہ ان دونوں کا تعلق مضمون آفرینی سے ہے نہ کہ تازہ گوئی سے۔ مضمون آفرینی کا مطلب ہے ایسا مضمون پیدا کرنا جس کی بنیاد کسی استعارے پر ہو یا بر بنائے مبالغہ، اس طرح کہ وہ حقیقت سے بعید ہو جائے بلکہ اس کی ضد بن جائے۔ پس اس کا تازہ گوئی سے کوئی تعلق نہیں ——— اسی طرح تازہ گوئی کو سبک ہندی کہہ کر غلط بحث پیدا کرنا بھی صحیح نہیں ——— سبک ہندی کے اپنے خصائص ہیں مگر اس موضوع پر کسی اور موقع پر قلم اٹھا سکوں گا۔